Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مُنہ اَور حرکت کرتے ہُوئے ہاتھ رُک گئے۔ چند لحظوں تک وہ سب نظریں جمائے اُن دونوں کو ہال کے پچھلے سرے پر ایک خالی میز تک جاتے ہُوئے دیکھتے رہے۔ ابھی وہ اپنی کُرسیوں پر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ہال میں سب طرف پاؤں گھسٹنے کی آوازیں اُٹھنے لگیں۔ دونوں کپتانوں نے اپنی خُودکار گنیں میز پہ رکھیں اُور کندھے سے خاکی تھیلے اُتار کر کرسیوں کے پاس زمین پر رکھ دیئے۔ پھر جیسے کسی ان کہے اِرادے کے تحت، ہال میں بیٹھے ہُوئے سب لوگ ایک دم اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہُوئے اور ایک ساتھ زور سے تالیاں بجانے لگے۔ کپتانوں نے مڑ کر حیرت سے یہ منظر دیکھا کہ سب لوگوں کے رُخ ان کی جانب تھے، نظریں اُن پر لگی تھیں، اَور وہ اُن کی طرف ہاتھ بڑھا بڑھا کر تالیاں بجا رہے تھے۔ ایک لحظہ وہ بے سمجھ نظروں سے اِن لوگوں کو دیکھتے رہے۔ پھر جب اُنہیں اصل معاملے کا احساس ہوا تو دونوں کے چہروں پر سرخی کا ہلکا سا رنگ دوڑ گیا۔ وہ جھینپتے ہُوئے مُنہ موڑ کر کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔ مگر تالیاں تھیں کہ بجے جا رہی تھیں۔ آخر دونوں کپتانوں نے بیٹھے بیٹھے مڑ کر دیکھا اَور ہاتھ اٹھا کر تالیوں کا جواب دیا۔ تالیاں روک کر ہال کے سب لوگوں نے اپنی اپنی کرسیاں میزیں چھوڑ کر دونوں فوجیوں کی جانب دوڑ لگا دی۔ فوجی افسروں نے اِس یلغار کو دیکھا تو اپنی گنیں میز سے اٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑی کر دیں۔ اب لوگوں کا ہجوم اُن دونوں کی پیٹھ ٹھونک رہا تھا۔ ایک ایک بندہ گھس گھسا کر آگے نکلنے کی کوشش میں تھا اَور فوجی نوجوان کی پیٹھ تھاپنا چاہتا تھا۔ "زندہ باد۔ زندہ بادہ" وہ ساتھ ساتھ پکارتے جا رہے تھے۔ "پاک فوج زندہ باد۔" جمگھٹے کے عقب میں دو بیرے چائے کے بڑے بڑے ٹرے اُٹھائے ہوئے رُکے کھڑے تھے۔ ایک ٹرے میں چائے کے برتن اَور دُوسرے میں کیک، پیسٹری، اُبلے ہُوئے انڈے، فرائی انڈے اَور بسکٹوں کا ڈھیر تھا۔ ایک آدمی پیٹھ تھپکا کر ہجوم سے نکلا تو اُس کی نظر بیروں پر پڑی۔ اُس نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اَور بٹوے سے سو روپے کا نوٹ نکال کر بیروں کے ساتھ کھڑے ہُوئے ہوٹل کے مینجر کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ "اِن سے پیسہ نہیں لینا،" اُس نے کہا۔

"توبہ توبہ جی، یہ تو ہمارے محسن ہیں،" مینجر نے کہا، اَور نوٹ آدمی کو واپس کرنے کی کوشش کی۔ "یہ رکھیں جناب، یہ تو ہماری عزت افزائی ہے۔ کچھ ہمیں بھی اپنا حق ادا کرنے دیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں نہیں،" آدمی نے ہاتھ ہلا کر اُسے منع کر دیا۔ پھر وہ کمر پہ ہاتھ رکھ کر خالی خالی نظروں سے ہال میں دیکھنے لگا۔ اُس کو پیسے نکال کر دیتے ہُوئے چند لوگوں نے دیکھا تھا۔ اُن میں سے ایک نے جیب سے سو کا نوٹ نکالا اَور لوگوں کو سامنے سے ہٹاتا ہُوا اَندر گھس گیا۔ آگے بڑھ کر اُس نے وہ نوٹ ایک کپتان کی اُوپر والی جیب میں ٹھونس دیا۔ کپتان نے اچنبھے سے اُسے دیکھا اَور نوٹ نکال کر اُسے لوٹانے کی کوشش کی۔ جب اُس شخص نے ہاتھ اپنے پیچھے باندھ کر لینے سے انکار کیا تو کپتان نے وہ نوٹ میز پر رکھ دیا۔ دیکھا دیکھی ایک دُوسرے شخص نے بٹوہ نکال کر سو کا نوٹ باہر کھینچا اَور دُوسرے کپتان کی جیب میں ڈالنے کی کوشش کرنے لگا۔ کپتان نے اُس کا ہاتھ پکڑلیا۔ وہ شخص جلدی سے نوٹ میز پہ رکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے بعد گویا بازی لگ گئی۔ ہر ایک نے اپنی اپنی جیب سے پیسے نکالنے شروع کر دیئے۔ زیادہ تر سو کے نوٹ نِکلے۔ جن کے پاس نہیں تھے انہوں نے چھوٹے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں اَور آدھی الگ کرکے میز پر رکھ دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے میز پر نوٹوں کی چھوٹی سی ڈھیری لگ گئی۔ جمگھٹے کے عقب سے پھر کِسی نے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ "پاک فوج، زندہ باد،" "پاک فوج کے مجاہد، زندہ باد،" ہندو بنیئے مردہ باد۔" کچھ لوگوں نے بغلی طرف سے بڑھنے کی کوشش کی جہاں دیوار کے ساتھ فوجیوں کی گنیں کھڑی تھیں۔ ایک کپتان نے ہاتھ اُٹھا کر اُنہیں آنے سے منع کر دیا۔ بیرے ٹرے اُٹھائے مشکل سے میز تک پہنچے۔ میز کی سطح پر نوٹ رکھے تھے۔ ایک افسر اپنی کُرسی سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے لوگوں کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ لوگ ایک لحظے کو رُک کر سیدھے ہُوئے، پھر پیچھے ہٹنا شروع ہو گئے۔ کپتان کے اشارے میں ایک ایسا اَنداز تھا کہ ہجُوم پر مکمل خاموشی چھا گئی۔

"آپ کا بہت شکریہ،" کپتان متانت سے بولا۔ اُس کے اَنداز میں تھکن کے آثار تھے۔ "آپ کی مہربانی ہو گی اگر آپ ہمیں یہاں بیٹھ کر ناشتہ کرنے دیں۔ ہمیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔"

"ضرور ضرور جناب،" چند لوگوں نے کہا، "زندہ باد۔ چلو بھئی، اپنی اپنی جگہ ----"

"زندہ باد،" ایک آدمی دُہرا کر بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ،" کپتان نے سارے نوٹ اِکٹھے کر کے اُن کی جانب بڑھائے، "یہ بھی لے جائیں۔"

"یہ،" نعرہ لگانے والے آدمی نے کہا، "ہماری طرف سے---- ہدیہ عقیدت----"

"ہمیں اِن کی ضرورت نہیں،" کپتان نے کہا، اَور نوٹ ساتھ بچھی ہُوئی خالی میز پر رکھ دیئے۔ بیروں نے آخر ناشتے کے نرے اُن کے سامنے رکھے۔ لوگ ایک ایک کر کے واپس جانے لگے۔ اچانک ایک موٹا سا آدمی، جو حلیئے سے دکاندار دکھائی دیتا تھا، پلٹ کر آیا۔ دُوسری میز سے سارے نوٹ اُٹھا کر اُنہیں ایک بیرے کے ہاتھ میں تھماتا ہُوا وہ بولا، جا، سامنے والے بنک سے اِن کی پرچیاں لے کر آ۔"

ایک بیرے نے فوجی نوجوانوں کی پیالیوں میں چائے اُنڈیلی۔ انہوں نے ناشتہ شروع کر دیا۔ دونوں میں جس کا رخ ہال کے لوگوں کی جانب تھا وہ کبھی نظر اٹھا کر انہیں دیکھ لیتا۔ بیچ بیچ میں دونوں آہستہ آہستہ باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ جب دُوسرا بیرا چھوٹے نوٹ لے کر بنک سے لوٹا تو وہ شخص جس نے اُسے بھیجا تھا، اُٹھا اَور بیرے سے نوٹوں کی گڈیاں پکڑ کر کپتانوں کی میز کی جانب بڑھا۔ ان کے پاس پہنچ کر اُس نے ہاتھ میں پکڑے ہُوئے نوٹ دونوں کے سر کے گرد تین تین بار گھمائے اَور واپس ہوٹل کے بڑے دروازے کے باہر، جو سڑک پہ کھلتا تھا جا کھڑا ہُوا۔ فقیروں کے غول کے غول اُمڈ کر آئے، جن میں اُس آدمی نے چھوٹے نوٹ بانٹنے شروع کر دیئے۔ فقیروں کے پیچھے شہر کے لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو کر تماشہ دیکھنے لگا۔

سرفراز جتنی دیر وہاں بیٹھا رہا جیب میں ہاتھ ڈالے اُنگلیوں کے درمیان اپنی اٹھنی کو گھماتا پھراتا رہا۔ اُس کی جانب کسی نے توجہ نہ دی۔ وہ جیسے آیا تھا اُسی طرح کھائے پیئے بغیر اپنا سامان اُٹھا کر ہوٹل سے نِکل گیا۔ ہاتھا پائی کرتے ہوئے گداگروں سے بچتا بچاتا ہُوا وہ جب سڑک کے پار پہنچا تو اس کے سامنے ایک بنی بنائی راہ اُکھڑ چکی تھی۔ تین روز تک وہ گاؤں میں اپنے گھر پہ رہا مگر اُس نے کسی سے دِل کی بات نہ کی۔ چوتھے روز وہ شہر واپس آیا اِور سیدھا ریکروٹنگ آفس گیا۔ وہاں پہ دریافت کرنے پر اُسے بتایا گیا کہ کمیشن کے کورس کے لِئے اُن لوگوں کی درخواستیں بھی وصول کی جا رہی ہیں جن کا انٹرمیڈیٹ کا نتیجہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نِکلنے والا ہے۔ بنیادی طبعی معائنے کے بعد اُس سے فارم بھروا کر رکھ لیا گیا۔

گھر واپس پہنچ کر اُس کی ہمت نہ ہُوئی کہ اعجاز سے اِس بات کا ذکر کرے۔ اُس کے مستقبل کا جو راستہ اعجاز نے متعین کر رکھا تھا وہ بی۔ اے یا ایم۔اے کرنے کے بعد مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کا تھا۔ تعلیم میں اپنے اعتماد کی بنا پر سرفراز کو بھی یقین تھا کہ وہ ان مرحلوں سے کامیاب ہو کر نِکلے گا۔ مگر شہر کے ایک ہوٹل کے اَندر دیکھے ہوئے واقعہ نے اُس سیدھے سادے رستے کو الٹ کے رکھ دیا تھا۔ اُن فوجی افسروں کی وردیاں، تھکاوٹ کے باوجود اُن کے اَنداز سے پھوٹتی ہُوئی قوت کا احساس، ان کا خودکار اسلحہ جس کے نزدیک بھی کوئی نہ پھٹک سکتا تھا، اِن چیزوں نے اُس کے دِل میں گھر کر لیا تھا۔ وہ زندگی کے ایک اَیسے مقام پہ پہنچا تھا جہاں پہلی بار اُس نے اپنے اصل راستے کی جھلک دیکھی تھی، اُور جس سے اُسے ایک انوکھی طمانیت کا احساس ہوا تھا۔ اُس کے اَندر کچھ اِس طرح کا عمل جاری ہو چُکا تھا کہ جیسے دِل کسی شے کو چاہے اَور یقین ہو جائے کہ یہی اُس کا نصب العین ہے۔ اب صِرف ایک ہی دِقت راہ میں حائل تھی، کہ وہ اعجاز کو کیسے بتائے؟؟

سرفراز اب گھربار اَور خرچے کی فکر سے آزاد ہو چُکا تھا۔ پیسے کی ریل پیل تھی۔ اعجاز کی ملکیت اراضی اب آدھے مُربعے سے بڑھ کر مُربعے سے اُوپر پہنچ چکی تھی، اَور جیب میں رقم ابھی اِتنی باقی تھی کہ وہ مزید زمین خریدنے کی خاطر بات چیت کر رہا تھا۔ سرفراز دِن بھر گھر میں بیٹھا یا باہر کھیتوں میں پھرتا یہی سوچتا رہتا کہ بھائی کے ساتھ اپنی بات کیسے چھیڑے۔ ایک روز کھرلوں کے کنوئیں پہ بیٹھے بیٹھے اُس نے محسوس کیا کہ وہ جتنا زیادہ سوچتا تھا اُس کا ذہن اُتنا ہی گڈمڈ ہوتا جا رہا تھا۔ اِس معاملے سے کچھ دیر کے لِئے چھٹکارا حاصل کرنے کو اُس نے پچھلے دو سال کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ یہ عمل سرفراز نے پڑھائی کے دوران سیکھا تھا۔ ایک موقعے پر اُسے اس بات کا علم ہوا تھا کہ اگر کِسی سبق کی پیچیدگیوں میں اُس کا ذہن پھنس کے رہ جاتا تھا تو اُسے وقتی طور پہ چھوڑ کر پرے رکھ دینا اُس کے لِئے فائدہ مند ثابت ہوتا تھا۔ پھر وہ ذہن کو آزاد کرنے کی خاطر کِسی ٹھوس اَور جانی پہچانی شے کے خیال میں مصروف ہو جاتا تھا، جس سے اُس کے ذہن میں وسعت کے رستے پیدا ہونے شروع ہو جاتے تھی۔ پچھلے دو برس کے واقعات ایسے تھے جن کا وجود اپنی جڑوں پہ قائم تھا اَور جن کے بارے میں کوئی شبہ، کوئی اُلجھن، کوئی مخمصہ نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔۔۔۔۔

ملک جہانگیر کو جب یقین ہو گیا کہ اعجاز پر اُس کی "سزا" کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نِکلا، بلکہ اُلٹا سارا سلسلہ ہی منقطع ہونے کا ڈر پیدا ہو گیا ہے، تو اس نے صلح جوئی کا رستہ اختیار کیا۔ متعدد بار پیغام بھیجنے کے باوجود اعجاز ٹس سے مس نہ ہوا تو آخر ایک روز وہ خُود چل کر ملک حمید کے گھر پر آیا۔ وہاں سے اُس نے حمید کے چھوٹے بھائی ملک رشید کے ہاتھ، جو بھائیوں میں چوتھے نمبر پہ تھا اَور سکول میں اعجاز کا ہم جماعت رہ چُکا تھا، بلاوا بھیجا۔ اعجاز سوچ میں پڑ گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ ملک جہانگیر چل کر آیا ہے، ہو سکتا ہے برادری پنچائیت بلا لے۔ مگر سکینہ اَور اس کا باپ ڈرے ہُوئے تھے۔

"پنچیت پر اللہ کی مار۔ پنچیت بلائے یا میلہ لگائے، جھنگیر سے جو بات کرے اُس کا مُنہ کالا۔ آپ نقصان کرے، آپ ہی پنچیت بلائے۔ اللہ کی مار۔ صاف صاف جواب دے دو۔" "نقصان کی بات نہیں سکو،" چاچا احمد بولا، "بزتی کی بات ہے۔ بدلہ لازم آتا ہے۔"

"چاچا بدلے کی بات کو چھوڑ،" اعجاز نے کہا۔ "اپنے آپ ہی معاملہ ٹھپ ہو جائے گا۔ لیبر میں بڑی گڑ بڑ ہے۔ مہینہ ہو گیا ہے، مزدُور زخم کھا کر ہسپتال میں پڑا ہے۔ رپٹ درج ہو گئی ہے۔ پرچہ کٹانے کی کوشش ہو رہی ہے، جس میں جہانگیر کو نامزد کیا جائے گا۔ اگر مزدُور مر گیا تو سمجھ لو کہ جہانگیر کا بیڑا غرق۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو،" سکینہ نے کہا۔

"جھینگر کو سبک تو آ جائے گا،" چاچا بولا۔

"تینوں کے تینوں مالک بڑے زمیندار ہیں۔ یہ بات نہیں کہ اَن پڑھ ہیں۔ پڑھے لکھے ہیں، عقل کی بات کر سکتے ہیں، مگر فیکٹریوں کا انہیں کوئی تجربہ نہیں۔ اپنی جاگیرداری کی تربیت سے پیچھا نہیں چھُڑا سکتے۔ ان کی ذہنیت نہیں بدلتی۔ جب موقع آتا ہے، یہ اپنی خصلت پہ آ جاتے ہیں۔"

"تو تیرا خیال ہے کہ مل بند ہو جائے گی؟"

"بند ہو یا چلتی رہے، یہ الگ بات ہے۔ مگر فساد ضرور ہو گا۔"

اعجاز، سکینہ اَور چاچا احمد گھر کے اَندر بیٹھے چند منٹ تک گفتگو کرتے رہے۔ ملک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رشید باہر صحن میں چارپائی پہ بیٹھا چائے کا پیالہ پیتا رہا۔ اعجاز نے سکینہ اور چاچے احمد کو بات کرنے سے منع کر دیا اور خود باہر جا کر ملک رشید کے آگے اِنکار کر دیا۔ نہ کوئی بہانہ بنایا، نہ عذر پیش کیا، صاف کہہ دیا کہ اُس کا دِل نہیں مانتا۔

"ٹھیک ہے، اعجاز،" ملک رشید نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "اپنی مرضی کے مالک ہو۔" ملک جہانگیر واپس چلا گیا۔ وہ ایسی خاموشی سے اپنی سبکی کرانے والوں لوگوں میں سے نہیں تھا۔ مگر اُسے علم تھا کہ ایک تو اعجاز اپنی ہٹ کا پکا تھا، دُوسرے، اُس کی پشت پہ چک بیاسی کے راٹھور کھڑے تھے۔ چنانچہ اُس نے اِس سلسلے میں مزید کوئی منفی یا مثبت اقدام نہ کیا۔ اعجاز کی سات ایکڑ فصل بچ رہی تھی۔ فصل بہت بھاری اُٹھی تھی۔

ایک روز سکینہ نے رات کو سونے سے پہلے ایک سرسری بات کی جس نے اعجاز کی سوچ کا دھارا بدل دیا۔

"جمعرات کو بیاسی میں بیاہ پر ہم نے بڑا مزیدار گُڑ کھایا تھا،" سکینہ نے ذکر کیا۔

"اُن کا اپنا گُڑ تھا؟" اعجاز نے سوئی ہُوئی آواز میں پوچھا۔

"نہیں۔ پشاور سے منگوایا ہُوا تھا۔"

"ہاں،" اعجاز نے کہا۔ "سرحد میں بڑا بھاری گُڑ بنتا ہے۔ اُدھر کی زمین گنے کو بہت مانتی ہے۔ شوگر ملوں سے پہلے وہاں کے سب زمیندار یہی کام کرتے تھے۔ بمبئی اور کلکتے تک اُن کا گُڑ سپلائی ہوتا تھا۔ صِرف گُڑ بیچ بیچ کر وہ بڑی حیثیت والے لوگ ہو گئے تھے۔ اُنہیں 'گُڑ خان' کہتے تھے۔"

"اُس میں میوے تھے،" سکینہ نے کہا۔

"میں نے بھی کھایا ہُوا ہے،" اعجاز نے کہا۔ "مزیدار ہوتا ہے۔"

اعجاز نے دوبارہ تندہی سے مزدُوروں کے درمیان کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ مغلپورے اور باغبان پورے کے علاقے کی بیسیوں چھوٹی چھوٹی ورکشاپوں فونڈریوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدُوروں کی بنائی ہُوئی انجمنوں، ایسوسی ایشنوں اور یونینوں کے باہمی رابطے کے کام میں دِن بھر مصروف رہتا تھا۔ اُس کے خیال میں ایک سکیم تھی کہ پہلے ایک ہی، ملتے جلتے پیشے کے مزدُوروں کی واحد تنظیم کے اندر اکٹھا کیا جائے۔ پھر اسے دُوسری بڑی تنظیموں، جیسے ریلوے یونین وغیرہ کے ساتھ منسلک کر دیا جائے۔ تاکہ ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑی اور فعال ٹریڈ یونین کے سایئے تلے ملک بھر کے مزدوروں کا اتحاد ہو سکے۔ فصل کی تباہی کے بعد کئی روز تک چاچا اور اعجاز کھیت میں سوتے رہے تھے۔ اب اعجاز کا معمول ہو چکا تھا کہ وہ آدھی رات تک گھر پہ سوتا، پھر اٹھ کر بندوق اٹھاتا اور فصل پہ چلا جاتا، جہاں اُس کی چارپائی پڑی رہتی تھی۔ پو پھٹنے پر وہ گھر واپس آ کر پراٹھوں کا ناشتہ کرتا اور ایک دو گھنٹے کے لیئے سو جاتا۔ نیند پوری کرنے کے بعد وہ اُٹھتا اور شہر کو نکل جاتا۔

"کچھ گھر کے لیئے بنا دو تو مزا آجائے،" سکینہ نے کہا۔ "آئے گئے کے آگے رکھنے کے کام بھی آئے گا۔"

"اچھا،" اعجاز نے غنودگی کی حالت میں جواب دیا۔

"میں ابے سے کہوں گی، باڈر پار سے پستہ بدام منگوا دے گا۔"

پھر سکینہ اور سرفراز نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ اعجاز، جو کھانا کھا کر آدھی رات تک یوں سوتا تھا کہ کروٹ نہ بدلتا تھا، آہستہ آہستہ دو ایک بار ہلا، پھر سیدھا اُٹھ کر بستر پہ بیٹھ گیا۔ اُس کی آنکھیں وا تھیں، اور نیند اُن سے غائب ہو چکی تھی۔

"ٹھیک تو ہو؟" سکینہ اُٹھ کر تفکر سے اعجاز کے پاس چارپائی پہ جا بیٹھی۔

"ہاں ہاں،" اعجاز سوتے ہوئے بولا، "کیوں نہ ہم سارا گڑ ہی ایسا بنائیں؟"

"سارے کا سارا؟" سکینہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ گھر کے لیئے بنا سکتے ہیں تو منڈی کے لیئے کیوں نہیں بنا سکتے؟"

"ہاں، لالہ،" سرفراز بولا، "کیوں نہیں بنا سکتے؟"

"کوئی ایسی بات ہی نہیں،" اعجاز نے کہا۔ "چاچا پستہ، بادام، اخروٹ، سب اُدھر سے منگوا دے گا۔ سستا بھی پڑے گا۔ گڑ میں میوہ ملا کر چھوٹی ڈلیاں بنائیں گے۔ منڈی سے وصولی ہو گی تو چاچے کا حساب بیباق کر دیں گے۔"

"مگر یہ تو منڈی میں سارا پیشاور سے آتا ہے،" سکینہ نے کہا۔

"بھئی اگر یہاں پہ ابھی تک کسی نے نہیں بنایا تو اِس کا یہ مطلب نہیں کہ بن نہیں سکتا۔ اصل چیز تو گڑ ہے۔ جمانے سے پہلے اس میں جو مرضی ہو ڈال دو۔"

"پہلے تھوڑا سا گھر کے لیئے بنا کر دیکھو،" سکینہ نے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ سارے کا سارا غرق ہو جائے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اچھا اچھا" اعجاز بے صبری سے بولا اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ مگر اُس رات کو وہ آرام کی نیند نہ سو سکا، کروٹ پہ کروٹ بدلتا رہا۔ اُس کے دماغ میں جو بیج داخل ہو چکا تھا اُس نے جڑ پکڑ لی تھی۔

گڑ کا بیلنا چلنے تک چاچے احمد نے وعدے کے مطابق خشک میوے کی گٹھڑیاں گھر پہنچا دیں۔ سارے کا سارا گاؤں "بداموں والا گڑ" بنتے دیکھنے کو اُمڈ پڑا۔ سکینہ کی بات کسی حد تک دُرست نکلی۔ میوے والا گڑ بنانے میں کئی مرحلے آئے۔ سادا گڑ بنانے کا طریقہ آسان تھا۔ گھی سے چپڑے ہُوئے لکڑی کے پیالوں میں گرم گڑ ڈالا اور پانچ منٹ کے بعد زمین پر پھیلائے ہُوئے کپڑے پر پیالوں کو اُلٹ دیا۔ گھنٹے دو گھنٹے میں کپڑا زائد پانی کو چوس لیتا اور گڑ چکیوں کی صورت میں جم جاتا۔ بادام پستے کی گریوں والا گڑ چھوٹی ڈلیوں کی صورت میں بکتا تھا، جو دیکھنے میں ہاتھ سے دبا دبا کر بنائی ہُوئی لگتی تھیں۔ گرم گرم گڑ ہاتھ میں نہ لیا جاتا، اور ذرا ٹھنڈا ہو جاتا تو ڈلی جمتے جمتے بھربھری ہو کر بکھر جاتی تھی۔ رات بھر تجربہ ہوتا رہا اور گاؤں کا کوئی تماشائی وہاں سے نہ ہلا۔ سارے کسان اپنے اپنے کام نبٹا کر آتے گئے۔ سرد رات میں وہ سب بھاری بھاری کیس لپیٹے، کماد کی چھال کے الاؤ کے گرد بیٹھے، حقہ گڑگڑاتے ہُوئے اپنی اپنی رائے پیش کرتے رہے۔ کوئی کہتا کہیں سے چھوٹی چھوٹی کٹوریاں حاصل کی جائیں، کوئی بولتا چمچے اور کڑچھیاں استعمال کی جائیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جہاں جہاں بادام پستے کی گریاں گڑ میں گڑی تھیں وہیں سے چکی چیخ کر ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھی۔ آخر کوئی تجویز کارآمد نہ ہوئی تو اعجاز نے اُس رات کے رس کی سب "پیالہ چکیاں" بنا ڈالیں۔ جو سب سے پہلے کڑاہ میں خشک میوے ملائے جا چکے تھے۔ اُن کی کٹی پھٹی چکیاں کچھ وہاں پہ موجود گاؤں کے لوگوں نے کھائیں، باقی کی اعجاز نے گھر کے لئے رکھ لیں۔

"واہ بئی واہ، اجاز،" رحمت چوہان نے اٹھ کر کھیس اپنے کندھوں سے اُتار کر جھاڑا اور ایک طرف رکھ دیا، "بڑی گرمی ہے، اِس گڑ میں۔"

"ہندوستان کے میوے ہیں، ہندوستان کے،" کسی نے کہا۔

"آگ کے اُوپر چنتڑ رکھ کے بیٹھا ہے،" خُدا بخش ارائیں بولا، "کسی کے لئے دو انگل نہیں کھسکتا۔ گرمی نہیں چڑھے گی تو اور کیا ہو گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آگ بنائی تیرے چاچے نے تھی؟" رحمت نے جواب دیا۔ "نہ تماکو لایا نہ حقہ، چرچر کرنے کو تیز ہے۔"

"چھوڑ چوہدری، لے، مُنہ میٹھا کر،" چاچے احمد نے کہا جو گُڑ کی تقریب کی خاطر اُسی روز پہنچا تھا، "کمی کمین کو مُنہ لگانا بول گنوانے والی بات ہے۔ یہ لے۔ کھا۔"

"کون ہے کمی کمین؟" خُدا بخش بھڑک اٹھا۔ "تیرا دادا میرے دادا کا مقروض تھا۔ اپنی دادی سے جا کر پوچھ۔"

سب ہنس پڑے۔ چاچے احمد کی دادی کو مرے ہُوئے ایک عرصہ گزر چُکا تھا۔ اُسی طرح نیم مذاق، نیم کینہ وری سے ایک دُوسرے پر پھبتیاں کستے، قصے کہانیاں سناتے ہوئے کِسان اُس وقت تک بیٹھے رہے جب تک کہ دوپہر کا چڑھا ہُوا کڑاہ آدھی رات کو آخری پُور اُتار کے ٹھنڈا نہ ہو گیا۔ بیلوں کو کھول کر ان کی آنکھوں سے کھوپے اتار دیئے گئے اور انہیں چارے کی کھرلی پر لے جا کر باندھ دیا گیا۔ پھر گاؤں کے لڑکوں بالوں کی باری آئی۔ رِواج کے مطابق وہ اپنے سینے اَور ٹانگوں کے زور سے بیلنے کو چلا کر جتنے گنوں کا رس نکال سکیں وہ اُن کی ملکیت ہوتا تھا۔ بیلنے کے آخری روز تو لڑکوں کی جوڑیوں میں شرطیں لگتی تھیں۔ پہلی شرط رس نکالنے پہ، اَور دوسری پینے پہ لگا کرتی تھی۔ رس نکالنے کا مقابلہ ہر سال خوشی محمد تیلی اَور اس کا بھائی داؤد جیتتے تھے، اَور رس پینے پر خُدا بخش ارائیں کا سولہ سالہ بیٹا نمبر لے جاتا تھا، جو ایک سانس میں رس کی مٹکی خالی کر دیتا تھا۔ اُس پہلی رات کو لڑکوں نے چار چھ کٹورے رس کے نکالے اور اُنہیں لے کر آگ کے پاس جا بیٹھے۔ چند منٹ تک لڑکوں نے کٹورے آگ کے قریب رکھ کر اُن کا ٹھار توڑا اَور پینے لگے۔ حقے بھی بجھ چکے تھے۔ لوگ ایک ایک کر کے اُٹھتے جا رہے تھے۔ وہ اپنے کپڑے جھاڑتے، کھیسوں کے پلوؤں کو دُرست کر کے بدن پہ لپیٹتے اَور اپنے گھروں کی راہ لیتے۔ آخر میں وہاں پہ اعجاز، چاچا احمد اَور سرفراز رہ گئے۔ اعجاز اَور چاچا احمد کا ٹھکانہ گُڑ کی رکھوالی کے لِئے وہیں پہ تھا۔ اُنہوں نے سرفراز کو گھر بھیج دیا۔ جب وہ لحاف اوڑھ کر سویا تو اُس کی سکیم ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔

اگلے روز اعجاز کِسی ورکشاپ سے ایک پختون پٹھان کو لے آیا۔ رستے میں اُس شخص نے، جس کا نام گل افروز خان تھا اَور ایک فونڈری میں مزدُور کا کام کرتا تھا، پنساری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی دکان سے میدے کی شکل کا سفوف خریدا اور ایک کپڑے کی دکان سے خُوب چھان بین کر کے، موٹی ململ کی قسم کا چند گز کپڑا لیا۔ دونوں چیزوں کے پیسے اعجاز نے ادا کئے۔ اُس رات کو گل افروز خان نے اپنا کمال دکھایا۔ اُبلتی ہُوئی رس کے کڑاہ میں "رنگ کاٹ" کے ساتھ ہی اُس نے یہ سفوف بھی چٹکیوں میں بھر کر چھڑک دیا۔ جب تمام تر آلائشیں اُتار لی گئیں تو گاڑھی رس پہلے کی نسبت قدرے لیس دار نِکلی۔ اُسی میں گل افروز خان نے مٹھیاں بھر کے بادام، اخروٹ، کچھ پستہ، مونگ پھلی اَور خرمانی کی گٹھلیوں کے "بادام" ملا دیئے۔ اُس کے بعد اُس نے کڑاہ تلے آگ دھیمی کرائی اَور کھڑا انتظار کرتا رہا۔ ساتھ ساتھ وہ اس کو کڑچھے سے اُٹھا کے واپس کڑاہ میں ٹپکاتا اَور اس کی "تار" کا معائنہ کرتا رہا۔ جب رس خُوب گاڑھی ہو کر گڑ بننے کی حد تک پہنچ چکی تو اس نے آگ مزید دھیمی کرا دی۔ پھر اُس نے ایک گز ململ کے کپڑے کے درمیان میں قینچی سے ایک انچ کا سوراخ کاٹا اَور کپڑے کو چاروں کونوں سے اُٹھا کر تھیلی کی شکل بنائی۔ جب کڑاہ میں گڑ ایک خاص درجہ حرارت تک ٹھنڈا ہو گیا تو گل افروز نے گڑ کٹوروں میں بھر بھر کر اُس تھیلی میں ڈالنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی وہ تھیلی کو اُسی ہنرمندی سے نچوڑنے لگا کہ وقفے وقفے پر گڑ کی ایک مقدار زمین پہ بچھائے ہُوئے کپڑے پر گرتی، کسی حد تک پھیلتی اَور جلد ہی جمنا شروع کر دیتی۔

"یہ پوڈر بے ضرر ہے، بے ذائقہ ہے،" گل افروز نے بتایا۔ "اِس کے اَندر دو خُوبی ہے۔ نمبر ایک، ڈلی کو جوڑ کے رکھتا ہے۔ نمبر دو، اَندر میوے کو تازہ رکھتا ہے۔ سال کے بعد کھائے گا تو کہے گا جیسے ابھی بنا ہے۔"

جب ڈلیاں جم گئیں تو ابھی اتنی نرم تھیں کہ ہاتھ میں دبا کر گول کی جا سکتی تھیں۔ چار چھ گھنٹے میں اُنہوں نے ٹھنڈے گڑ کی سختی اختیار کر لی۔ اب گاؤں والوں نے، جو پٹھان کی کارستانی کو دیکھنے کے لِئے سارا دِن دُہرے اشتیاق سے بیٹھے رہے تھے، ایک ایک ڈلی کو اُٹھا کر، چاروں طرف سے گھما گھما کر دیکھا۔ اعجاز کو پتا چل گیا کہ یہ کِسان اپنے طبعی شک کے باعث اِسے مُنہ میں ڈالنے سے پرہیز کر رہے ہیں۔ "چکھ کے دیکھو،" اُس نے گل افروز خان سے کہا۔ گل افروز نے ایک ڈلی اُٹھا کر چبائی۔ اُسے نگلنے کے بعد وہ انگلی اٹھا کر بولا، "ایک نمبر۔" ایک منٹ تک پٹھان کو بغور دیکھتے رہنے کے بعد سب نے ایک ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈلی اٹھائی اور اُسے چبا چبا کر کھانے لگے۔

"بئ واہ،" کئی آوازیں اُٹھیں۔ "واہ بئ واہ۔"

"پٹھان نے کام کر دکھایا ہے۔"

"بالکل پشاوری گڑ ہے۔"

"چودری،" گل افروز بولا، "مردان کے خانوں کا گڑ بناتے زندگی نِکل گیا۔ اب شوگر ملیں لگ گیا تو اپنا کام بند ہو گیا۔ قسمت کا بات ہے۔ مگر یہ ہاتھ جب گڑ بنائے گا تو اصل دراصل ہو گا۔"

خُدا بخش ارائیں جو پیدائشی شکی مزاج تھا، بولا، "مُنہ کا مزا تو ہے۔ مگر خالص نہیں۔"

"کیا مطلب تیرا کہ خالص نہیں؟" چاچے احمد نے سختی سے پوچھا۔

"دواء ملی ہُوئی ہے،" خُدا بخش نے کہا۔

دیکھ چودری،" گل افروز بھڑک کر بولا، "تم گھر میں کالا گُڑ کھاتا ہے؟"

"نہیں،" خُدا بخش نے جواب دیا۔

"سفید گُڑ کھاتا ہے؟"

"ہاں۔"

"سفید کیسے ہوتا ہے؟"

"رنگ کاٹ سے ہوتا ہے۔"

"تو پھر؟ وہ کوئی آسمان سے اُترا ہے؟ وہ پوڈر بھی دوائی، یہ پوڈر بھی دوائی۔ دونوں فیدے مند دوائی ہے۔ ایک میل نکالتا ہے، دُوسرا گڑ کو جوڑتا ہے، میوے کو تازہ رکھتا ہے، اور دیکھ چودری، اگر دوائی پسند نہیں تو میں کوار گندل سے بنا کر دکھاتا ہُوں۔ مگر ایک چٹکی دوائی جتنا کام کرتا ہے اس کے برابر کوار گندل کا گٹھا ضرورت ہے۔ وہ تُم ڈھونڈ کر لائے گا؟"

خُدا بخش سے جواب نہ بن پڑا تو ٹھنڈا ہو گیا، گو دو ایک بار اس نے زیرِ لب "نخالص، نخالص" کہا۔ مگر سب کو اس کی نکتہ چیں طبیعت کا علم تھا۔ کسی نے اُس کی طرف دھیان نہ دیا۔ تجربہ کامیاب رہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہلے روز گڑ منڈی میں گیا تو آڑھتیوں نے شک کی نظروں سے دیکھا۔ "پشاوری ہے؟"

"ہاں،" اعجاز کے آدمی نے کہا۔

اُس روز گڑ کی نیلامی نہ ہُوئی اَور نوکریوں کو آڑھتیوں کے گودام میں رکھوا دیا گیا۔ اگلے روز چاچے احمد نے تجویز پیش کی کہ آئندہ سے گل افروز خان کو گڑ کی نوکریوں کے ہمراہ منڈی میں بھیجا جائے۔ وہ ظاہر کرے کہ گڑ پشاور سے لے کر آیا ہے۔ گل افروز خان نے اُس وقت ذہانت کا ثبوت دیا۔ "چھ سات نوکری روز پشاور سے کیسے آئے گا؟" وہ بولا "سات دِن کا سٹاک اِدھر کرو، پھر ریہڑے پر لاد کر لے جاؤ، بولو کہ پشاور سے بلٹی آیا ہے۔ منڈی والا پھر مانے گا۔"

اَیسا ہی کیا گیا۔ گل افروز خان سے بات کر کے آڑھتیوں نے مزید پوچھ گچھ کئے بغیر کم سے کم بھاؤ کی حد طے کرلی۔ دکانداروں کو اطلاع پہنچ گئی کہ میوے والا ایک نمبر پشاوری گڑ سستے داموں بک رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ دِن کی کھیپ اُٹھ گئی۔ مقابلتاً سستے بھاؤ بیچنے کے بعد بھی حساب لگانے پر یہ گڑ سادے کی نسبت تین گنا قیمت دے گیا۔ میوے کی قیمت، ریہڑے کے کرایئے، اور گل افروز کی مزدُوری نکال کر سو فیصد منافع نِکلا۔ اعجاز کے حساب کے مطابق شوگر مل کو بیچنے کی نسبت ستر اسی فیصد زیادہ نفع ہوا تھا۔ اُسے یقین نہ آ رہا تھا کہ گھر سے نِکلی ہُوئی سکیم اتنی حیرتناک کامیابی حاصل کر سکتی تھی۔ وہ ہر کِسی کی احسانمندی اَور بندش سے آزاد ہو چُکا تھا۔ دو ہفتے کی آمدنی میں سے پیسے نکال کر اُس نے میٹھے چاولوں کی دو دیگیں پکوائیں اور گاؤں بھر میں تقسیم کیں۔ اعجاز کا آدھا کماد ابھی کٹا نہ تھا اُس نے گل افروز خان کو فصل کے اِختتام تک کل وقتی ملازمت پر رکھ لیا۔ گل افروز کارخانوں میں دیہاڑی کی مزدُوری کرتا تھا، اٹھ کر اعجاز کے پاس آگیا۔ اُس نے دِن رات کا ڈیرہ فصل پہ لگا لیا اور گنے کی کٹائی، گڑ کی بنائی، سنبھال اَور لدان سے لے کر منڈی میں نیلامی اَور آڑھتیوں سے رقم کی وصولی کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ آہستہ آہستہ بات گاؤں سے نِکل کر منڈی میں پہنچ گئی اَور آڑھتیوں کو علم ہو گیا کہ گڑ پشاور سے نہیں بلکہ شجاع آباد سے گل افروز خان "پشاوری" کی نگرانی میں بن کر آتا ہے۔ مگر اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ مال چل نِکلا۔ پہلی بار اعجاز کی جیب میں اتنی رقم آئی تھی کہ اُس نے شہر کے بنک میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جا کر اپنے نام کا حساب کھولا تھا۔ اعجاز کے اندر ایک اور تبدیلی بھی پیدا ہو گئی۔ ملک جہانگیر نے گڑ کی کامیابی پر اپنے منشی کے ہاتھ اعجاز کو مبارکباد کا پیغام بھیجا۔

"اِس بے مراد کی اب کِس کو ضرورت ہے،" سکینہ نے کہا۔

"ضرورت کی بات نہیں سکینہ،" اعجاز بولا، "وقت کی بات ہے۔"

"وقت اب اُس کا ہے یا ہمارا؟"

"اُن کا بھی ہے، ہمارا بھی ہے،" اعجاز نے کہا۔ "وقت آئے تو ہاتھ کو روک کے رکھو۔ اسی میں فائدہ ہے۔"

"فائدہ کِس بات کا؟ ہم نے اپنا فائدہ خُود کمایا ہے۔ زیادتی اس نے کی تھی یا ہم نے؟"

"ٹھیک ہے۔ مگر ہر جانے کی پیشکش بھی اُس نے ہی کی تھی۔ پِھر وہ چل کے بھی آیا تھا۔ ہم نے ہر بار اُسے ٹھکرا دیا۔ اب وہ مجھ سے کوئی فائدہ بھی نہیں اُٹھا سکتا۔ پِھر بھی پیش قدمی کر رہا ہے۔ کیوں؟ سوچنے والی بات ہے۔"

"پھر کوئی بدمعاشی اُس کے دِل میں ہو گی،" سکینہ نے کہا۔

"بدمعاشی ہو یا کچھ اَور ہو، مگر یہ دُنیاداری ہے۔ اسے سیاست بھی کہتے ہیں۔ تجھے اِن باتوں کی سمجھ نہیں۔"

"پھر سمجھاؤ،" سکینہ تڑک کر بولی۔

"سیاست کے زور پر یہ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں اَور ہم لوگوں کو چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھائے رکھتے ہیں۔ ہم لوگ چار پیسے کما کر اِن کے مقابلے پر نہیں آ سکتے۔ اِن کا سامنا کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، کہ اِن کے طور طریقے اپناؤ۔ ان کو پچھاڑنا ہے تو سیاست کی مار مارو۔"

سکینہ بے سمجھی سے آنکھیں وا کئے اعجاز کو دیکھنے لگی۔ اعجاز دروازے پر کھڑے منشی کے پاس گیا۔ "ٹھیک ہے کریم شاہ،" وہ منشی سے بولا۔ "ملک صاحب سے کہنا پیغام کا شکریہ۔ آپ کی دعائیں اَور اللہ کا فضل شاملِ حال رہا تو خیر ہی خیر ہے۔"

منشی کریم شاہ نے اعجاز کی بات سنی تو سارے دانت نکال کر ہنسا اَور سلام لے کر چلا گیا۔ سکینہ دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ مگر سرفراز کو اعجاز کے مزاج میں اِس تبدیلی کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

درک ہو گئی۔ خوشگوار حیرت کے ساتھ وہ سوچتا رہا کہ یہ تبدیلی کیسے رونما ہوئی؟ اِس کے پیچھے کاروبار کی کامیابی تھا یا کہ مزدوروں کے درمیان اُس کی کامرانی، جن کی کم از کم تین انجمنوں کو ملا کر اُس نے ایک یونین بنا ڈالی تھی، گو اِس میں اُس کا ایڑی چوٹی کا زور لگ گیا تھا؟ جو کچھ بھی تھا، اِس خود اعتمادی پہ اُس نے سے اعجاز کے اندر، اور اُس کے ذریعے اپنے آپ میں، ایک نئی قوت کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ اعجاز کی طبیعت میں ایک نرم روی اور لچک پیدا ہو چکی تھی، جس کی بدولت وہ بڑی سے بڑی بات کو بھی صبر اور تحمل کے ساتھ لیتا اور ہر پہلو سے سوچ کر فیصلہ کرتا تھا۔ سرفراز کو یقین تھا کہ اِس تبدیلی کا بڑا حصہ اعجاز کے مزدوروں کے ساتھ کام کرنے کا نتیجہ تھا۔ سرفراز نے دیکھا کہ گاؤں کے لوگوں کو بھی قدرتی طور پہ اس حقیقت کا فہم ہو چکا تھا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ، اپنے چھوٹے چھوٹے مسئلوں کے بیچ اعجاز سے مشورے لینے کے لِئے آنے لگے تھے۔

جس روز سرفراز کو پہلے انٹرویو کے لِئے خط آیا اتفاق سے وہ گھر پہ موجود نہ تھا۔ خط اعجاز کے ہاتھ لگ گیا۔ جب سرفراز گھر پہنچا تو اُس نے اعجاز کے چہرے پہ ایک عجیب سی کیفیت دیکھی۔ سرفراز کا راز فاش ہو چکا تھا۔ اتنے دنوں کے اندر پہلی بار اُسے اعجاز کی طبیعت میں ہلچل کے آثار نظر آئے تھے۔ مگر اعجاز نے اپنے اُوپر قابو پائے رکھا۔ اُس نے نرمی سے حقیقت حال دریافت کی۔ سرفراز نے بتا دیا۔ اب وہ دِل کو تھامے کھڑا تھا کہ اعجاز پوچھے گا، "کیوں؟" یا پوچھے گا کہ پڑھائی کا کیا بنے گا؟ یا کوئی ایسی بات کرے گا جس سے سرفراز کا دل بھر آئے گا اور وہ جواب نہ دے سکے گا۔ مگر اعجاز اُس خط پر نظریں جمائے خاموش بیٹھا رہا۔ کئی منٹ کا وقفہ گزر گیا، جس کے دوران اعجاز کی تیز تیز چلتی ہوئی سانس دھیمی ہوتی ہوئی ہموار ہوئی، اور پھر معدوم ہو گئی۔ چند لمحے کے لِئے اعجاز کا سکوت ایسا مکمل تھا جیسے وہ کہیں دفن ہو گیا ہو۔ سرفراز کا جی گھبرانے لگا۔ وہ جا کر اعجاز کے پاس چارپائی پہ بیٹھ گیا۔ جب اعجاز نے سر اٹھایا تو اُس کی آنکھیں، جن کی چمک اُس کے چہرے کی ایک خاص شے تھی اور لوگ جس کا ذکر کیا کرتے تھے، دھندلائی ہوئی تھیں، جیسے ان کے ستارے بجھ گئے ہوں۔ اس نے خاموشی سے کاغذ سرفراز کی جانب بڑھا دیا۔

"ٹھیک ہے، لالہ؟"

"ہاں" کچھ دیر کے بعد اعجاز نے جواب دیا، "ٹھیک ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ ابھی پہلا اِنٹرویو ہے،" سرفراز نے کہا "خُدا جانے پاس بھی ہوتا ہوں کہ نہیں۔"

"ہو جاؤ گے،" اعجاز نے ہولے سے کہا۔

سرفراز کا دِل مسلسل بیٹھتا جا رہا تھا، جیسے کسی نے اُس پہ ایک من کا وزن رکھ دیا ہو۔ لحظہ بہ لحظہ اُسے اعجاز کی باتیں یاد آ رہی تھیں جو وہ کبھی نہ کبھی، وقفے وقفے پر کرتا رہا تھا۔ "سب سے مشکل امتحان میٹرک کا ہوتا ہے۔ ایف۔ اے کا اُس سے آسان ہوتا ہے۔ پھر بی۔اے کا اُس سے بھی آسان اور ایم۔اے میں تو صِرف ایک ہی مضمون ہوتا ہے۔ ایک بار وہاں تک پہنچ جاؤ تو ایسے،" وہ چٹکی بجا کر کہتا، "نِکل جاؤ گے۔۔۔۔۔"

"اصل طاقت امیروں وزیروں میں نہیں ہوتی، اصل طاقت صِرف حکومت کے افسروں میں ہوتی ہے۔ کیا غریب، کیا امیر اَور کیا وزیر، سب اُنہیں سے کام کراتے ہیں۔ بس مقابلے کا امتحان پاس کرنے کا سلسلہ ہے۔ پھر تُم مجسٹریٹ بنو، سب جج بنو یا ڈی۔ایس۔پی لگو، سمجھو لو کہ اقتدار تُمہارے ہاتھ میں آگیا۔ ملک جہانگیر اور ملک حمید جیسے لوگ تُمہارے دفتر میں جوتیاں چٹخاتے پھریں گے۔۔۔۔۔"

اِن خیالات کو روکنے اَور اپنے دِل کا وزن اُٹھانے کا سرفراز کو ایک ہی طریقہ سوجھ رہا تھا، کہ وہ باتیں کرتا جائے اَور اعجاز کی زبان کھولے۔

"حاضری ضروری نہیں ہے، لالہ۔"

اعجاز اُسی لہجے میں توقف سے بولا، "کیوں نہیں۔ ضرور جاؤ۔"

"لالہ، وہاں پڑھائی بھی ہوتی ہے۔ بی۔اے کی ڈگر ملتی ہے۔"

"اچھا؟" اعجاز بے خیالی سے بولا، "پھر تو ٹھیک ہے۔"

"میری مرضی ہے جاؤں یا نہ جاؤں،" سرفراز بیتابی سے بولا۔

اعجاز ایک منٹ تک خاموش رہا۔ پھر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ باہر جاتے ہُوئے وہ ہَولے سے بولا، "تُمہاری مرضی ہے بھئی جاؤ، کیوں نہیں جاتے۔ یہ بھی اچھی لائن ہے۔"

سورج سَر سے ڈھل رہا تھا۔ گھر کی دیواروں سے لپٹی ہُوئی دھوپ سہ پہر کی خاموشی میں اضافہ کر رہی تھی۔ کمال راز داری سے یہ سکوت سرفراز کے دِل میں راہ پا گیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تمہاری مرضی ہے بھئی،" اعجاز کے اِن چار الفاظ نے اُس کے اَندر ایک وسیع، یخ بستہ خلاء پیدا کر دیا تھا۔ اِس وسعت میں اس نے اپنے آپ کو ایک ہی جست کے اندر لڑکپن کی حدود سے نِکل کر جوانی میں داخل ہوتے ہُوئے دیکھا، جہاں وہ اپنی مرضی کے مطابق اقدام کرنے پر قادر بنا دیا گیا تھا۔ اِس مہیب ذمہ داری کے احساس نے اُس کے دِل میں خوف کی پرچھائیں پیدا کر دی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اُس نے محسوس کیا کہ جن سینکڑوں تاروں سے وہ اعجاز کے ساتھ بندھا ہُوا تھا اُن میں سے ایک تار کہیں سے چھنک کر ٹوٹ گئی ہے۔ دروازے سے باہر جاتی ہُوئی اعجاز کی پشت دیر تک اُس کی نظروں کے سامنے رہی اَور زندگی میں پہلی بار سرفراز نے دنیا میں اپنی ذات کے اکیلے پن کو ایسی شدت سے محسوس کیا کہ اُس کے اَندر کا خلاء پھیل کر اُس کے گرداگرد لپٹ گیا۔ سود وزیاں کے اِس گھنے احساس کو تھامے وہ چارپائی پہ گم سم بیٹھا رہا۔ سامنے والی سفید مٹی کی دیوار پر چمکتی ہُوئی دھوپ نے شیشے کی شکل اِختیار کر لی جو اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے، بیچ سے آہستہ آہستہ تڑخنے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حِصّہ پنجم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باب 8

ہم چھ لڑکے تھے۔ دو ٹیکسیوں میں بمشکل ہم اور ہمارا سامان آیا۔ ٹیکسی والوں نے ہمارا سامان اُتارا اور ہمیں چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ ہم وہاں کھڑے تھے کہ ایک ہونق سی جسامت والا لڑکا ہمارے پاس سے گزرتا گزرتا رُک گیا۔ بدقسمتی سے میں آگے کھڑا تھا۔ لڑکا مجھ سے مخاطب ہو کر بولا،

"وِچ پلیس ڈو یو ڈِسگریس؟"

"جی؟" میں نے پوچھا۔

"واٹ اِز جی؟ نو جی شی ہیز،" وہ بولا ، "سپیک اِن انگلش یُو پیزنٹ۔"

"یس،" میں نے کہا۔

"یس سر،" وہ چیخ کر بولا۔

"یس سر۔"

"وِچ پلیس ڈو یو ڈِسگریس؟"

"آئی ڈونٹ انڈرسٹینڈ۔"

"سر،" وہ پھر چیخا۔

"سر،" میں نے دہرایا۔

"آئی ایم آسکنگ یو، وچ پلیس ڈو یو کم فرام؟"

"شجاع آباد سر۔"

"ویئر اِز دیٹ ڈمپ؟"

"نیئر لاہور سر۔"

"سو آئی ایم رائٹ، یو آر این اَن ایجوکیٹڈ پیزنٹ۔"

میں خاموش رہا۔

"آنسری،" وہ پھر چیخا۔

"یس سر،" میں نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یس سر واٹ؟"

"آئی ایم اے پیزنٹ سر۔"

"این اَن ایجو کیٹیڈ پیزنٹ۔"

"این اَن ایجو کیٹیڈ پیزنٹ سر۔"

پہلے اُس نے ہم چھ لڑکوں پہ، پھر ہمارے کالے اَور براؤن بکسوں پہ، جو ہم نے یہاں آنے سے پہلے اپنے بازار سے نئے خریدے تھے، ایک حقارت آمیز نظر پھینکی، جیسے کہ وہ ہمیں اَور ہمارے سوٹ کیسوں کو ایک ہی قسم کی چیز سمجھتا ہو۔

"دِس ٹریش،" وہ ہمارے سامان کی جانب اشارہ کرکے بولا، "مائی فادر وِل لفٹ آر یور فادر وِل لفٹ؟"

اگر دنیا میں کہیں پر بھی کوئی اور لڑکا مجھ سے ایسی بات کرتا تو وہ اپنے پیروں پہ کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ بات ابھی اُس کے مُنہ میں ہوتی اَور وہ زمین پہ گرا ہوا ہوتا اَور میں اُس کے اُوپر چڑھا ہُوا ہوتا۔ گاؤں کے ماحول میں پل بڑھ کر اَور کچھ نہیں تو کم از کم اِتنی ہمت تو آ جاتی ہے۔ مگر اُس وقت معاملہ عجیب و غریب تھا۔ یہ پہلی بار تھی کہ میں کسی پہاڑی علاقے میں آیا تھا۔ ایک دفعہ کالج کے دُوسرے سال ہم چاروں ساتھیوں کا پروگرام بنا تھا کہ مری کی سیر کو جایا جائے۔ مگر آخری وقت پر غلام حسین اَور سلیم کے پاس پیسے پورے نہ ہوسکے اَور پروگرام ختم ہو گیا تھا۔ اب اِس مقام پہ بلند و بالا پہاڑ اَور طویل القامت درختوں کے جنگلات کو دیکھ کر ہم پہلے ہی کچھ خم کھا چکے تھے۔ پھر اکیڈمی کی عمارت، اس کے سبزے اَور سڑکوں کی صفائی ایسی کہ فالتو پرزہ کہیں گرا ہُوا دکھائی نہ دیتا تھا، خوش لباس ملازمین ایسی سبک قدم چال والے کہ جیسے ہوا پہ چل رہے ہوں، اِس تمام تر نظام کا دبدبہ ہماری حسیات پہ اثر کر چُکا تھا۔ اُوپر سے ایک نوجوان لڑکا جو ہماری عُمر کا تھا مگر اپنے سر کی سفاک حجامت کے باعث خونخوار نظر آتا تھا، تلوار کی دھار کی مانند اِستری شدہ پتلون قمیض اور چمکتے ہُوئے جوتے پہنے، تنی ہُوئی چھاتی سے چلتا ہُوا آیا تھا اَور ہم سے ایسے لہجے میں مخاطب ہوا تھا کہ جیسے حکم چلانے کا اختیار اُس کو قدرت کی جانب سے ملا ہُوا ہو۔ ہم میں سے کِسی ایک کی بھی زبان نہ کھل سکی۔

"نو۔۔۔۔" ہمارے ساتھی شوکت نے جُرأت کرکے جواب دینا شروع کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نو سر،" شوکت نے کہا۔

"پک اِٹ اَپ۔"

ہم نے غیر یقینی سے نظروں سے اپنے سامان کی جانب دیکھا۔

"پک اِٹ اپ۔ پک اِٹ اپ۔"

ہم نے فوراً اپنے اپنے بکس اَور تھیلے اٹھا کر کندھوں پر رکھ لِئے اور کھڑے اُس کا مُنہ دیکھنے لگے۔

"گو ٹو دَیٹ بلڈنگ،" اِس نے ایک بیرک نما عمارت کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ ہم اُس کی طرف چل پڑے۔

"ڈبل اَپ،" وہ بولا۔

ہم تیز تیز چلنے لگے۔

"ڈبل اپ۔" وہ اتنے زور سے چیخا کہ ہم ڈر کے مارے دوڑ پڑے، مگر اُس کے الفاظ مستقل ہمارا پیچھا کرتے رہے، "ڈبل اپ، ڈبل اپ، ڈبل اپ۔۔۔" اُس کی آواز کے ساتھ ساتھ ہم تیز سے تیز تر ہوتے گئے۔ اپنا بھاری سامان کچھ کندھوں، کچھ سروں پر اٹھائے دو سو گز تک دوڑتے ہُوئے جب ہم لکڑی کی اُس عمارت تک پہنچے تو سینے میں ہماری سانس بند ہونے کے قریب تھی۔ یہ کیڈٹ کمپنی آفس تھا۔ وہاں پہ ایک سنجیدہ، نیم خوشگوار شخص نے سینیئر انڈر آفیسر کے نام سے اپنا تعارف کرایا، اَور ہمیں ابتدائی معلومات فراہم کیں۔ ہم چھ لڑکوں کو فرسٹ کیڈٹ بٹالین کی طارق کمپنی میں متعین کیا گیا۔ ہمارے ساتھ مزید پانچ لڑکے آ شامل ہُوئے تھے جنہیں صلاح الدین کمپنی نے بھیجا گیا۔ پھر سینیئر انڈر آفیسر نے ہمیں ایک جمعدار صاحب کے حوالے کیا جن کا تعارف "این سی او گل نواز" کر کے کرایا گیا۔ اُس کی ڈیوٹی ہمیں اپنے "کوارٹرز" تک پہنچانے کی تھی۔ این سی او گل نواز جو کیڈٹ کمپنی آفس میں خاموشی اَور قاعدے سے کھڑا رہا تھا، باہر نِکلتے ہی ایک درندہ بن گیا۔ اُس کے مُنہ سے ایک دھاڑ نِکلی۔ یہ آواز اِتنی غیر متوقع تھی کہ ہم چونک کر تقریباً اچھل پڑے۔

"آن یور ہیڈز،" اس نے ہمارے بکسوں کی جانب اشارہ کر کے کہا، جنہیں ہم ہاتھوں میں لٹکائے لِئے جا رہے تھے۔ ہم جو گھر سے روانہ ہوتے ہی اپنے آپ کو افسر تصور